واقعاتِ سیرتِ نبویؐ میں توقیتی تضاد اور اُس کا حل

از

جناب مولوی اسحٰق النبی صاحب علوی، رام پور

(۲)

مقالہ دوم

مقالۂ گذشتہ اور زیرِ نظر مقالہ حقیقتاً میری کتاب "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" کا ایک حصّہ ہیں، یہ کتاب روایاتِ سیرت کے توقیتی تضادات کا ایک حل پیش کرتی ہے، "بُرھان" میں ان مقالوں کی اشاعت کی غرض یہ ہے کہ اربابِ علم ان کو بغور ملاحظہ فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے سرفراز فرمائیں، اور ان میں جو واقعاتی یا استدلالی غلطیاں نظر آئیں ان سے مجھے مطلع کرتے رہیں تاکہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ایسے تمام شکوک، شبہات اور خامیاں نظر آجائیں جن تک میری نظر ہنوز نہیں پہنچی۔

"پیغمبرِ اسلامؐ" کی "حیات کے مسائل، صرف اسلام، یا تنہا مسلمانوں کی جاگیر نہیں، بلکہ پوری "انسانیت" اور "انسانی تاریخ" کے مسائل ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ تمام اربابِ علم، جو تاریخ اور انسانی تمدن سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس سلسلے میں میری پوری مدد کریں گے، اور یہ مشترک اقدام تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھا دے گا۔

گذشتہ مقالے میں یوں تو نقل در نقل اور کتابت کی بے شمار غلطیاں نظر آتی ہیں، اور خاص طور پر انگریزی الفاظ اور حوالے بالعموم "جرمن" یا "روسی" ہو گئے ہیں، جن کی تصحیح کا یہ موقع نہیں، البتہ دو تین

مقامات پر تصحیح نہایت ضروری ہے۔

صفحہ ۲۸۰ کی سولہویں اور سترھویں سطر اِس وقت یُوں ہے:

"اور عاشورہ کسی طرح محرم میں واقع نہیں ہوا (کیوں کہ از روئے حساب) ہجرت سے دس۱۰ اور بیس۲۰ سال پہلے اور بیس۲۰ اور تیس۳۰ سال بعد ایسا ہو سکتا ہے"

یہ عبارت یوں ہونا چاہئے۔

"اور عاشورہ کسی طرح محرم میں واقع نہیں ہوا' (کیوں کہ از روئے حساب) ہجرت سے ۳ — ۱۰ سال پہلے اور ۲۰ — ۳۰ سال بعد ایسا ہو سکتا ہے۔"

اس صفحے کی آخری سطر یعنی (اور دونوں تاریخیں یعنی دسویں تشری اور دس محرم' ایک دن واقع ہوئی تھیں) قوسین میں ہونا چاہئے، یہ البیرونی یا سخاؤ کی عبارت نہیں۔

صفحہ ۲۸۷ کی سولھویں سطر میں عروہ بن زبیر کی جگہ "عکرمہ" پڑھنا چاہئے۔

صفحہ ۲۹۳ کی پہلی سطر میں لفظ "مختلف" رہ گیا ہے جس سے مفہوم ہی ختم ہو گیا، اس کو اس طرح پڑھئے۔

"دونوں شہروں میں ایک ہی نام کے مہینے مختلف اقدارِ زمانی رکھتے تھے"

صفحہ ۲۹۵ کی آخری سطر میں لفظ "کبیسہ" رہ گیا ہے، یہ عبارت یوں ہے،

اس تقویم میں وقتاً فوقتاً کبیسہ مہینے اضافہ ہوتے رہتے،

باقی غلطیوں کی تصحیح دوسری فرصت میں کی جائے گی ——— (عَلوی)

اوراقِ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے بہت پہلے عربوں میں توقیتی تصورات موجود تھے، اور اگرچہ قدیم عربی کتبات و آثار میں عام طور پر سنین و شہور نظر نہیں آتے، تاہم جنوبی عرب میں کچھ کتبے ایسے ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی کی ابتدا سے پہلے یہ دستور شروع ہو گیا تھا، چنانچہ یمن میں "مبحوض بن ابحض" (MABHUD BIN ABHAD) کا سنہ جو غالباً ۱۱۵ سنہ ق، م میں جاری کیا گیا تھا ابرہہ کے زمانے تک رائج رہا اور اس کے ایک کتبے پر موجود ہے۔[1]

---

[1] ENCYCLOPIADIA OF ISLAM VOL I 377.

مسعودی اور دوسرے علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے عربوں میں بڑی کثرت سے سنین رائج تھے، اور ہر قبیلے میں جدا جدا مشہور واقعات یا اکابر کے نام سے شمارِ ایام کیا جاتا تھا۔[1] حتیٰ کہ بعض غیر ملکی سنہ تک رائج ہو گئے تھے، مثلاً یہودی سنہ یا سنہ سکندری[2] جو اگرچہ یہود و نصاریٰ تک محدود تھے مگر عربی تاریخ پر موثر ہیں، میں دوسرے سنوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سمجھتا ہوں، مگر ان دونوں سنوں کا تذکرہ چونکہ کئی جگہ آئے گا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے مہینوں کے نام بیان کر دیئے جائیں:

یہودی سنہ کی ابتدا مذہبی طور پر تو ماہ "نیسان" سے ہوتی تھی، لیکن عام کاروبار میں عرصۂ دراز سے ماہِ تشری پہلا مہینہ شمار کر لیا گیا تھا، اس اعتبار سے مہینوں کی ترتیب حسب ذیل تھی۔[3]

۱- تشری - ۷	۵- شباط - ۱۱	۹- سیوان - ۳
۲- ہسوان - ۸	۶- ادار - ۱۲	۱۰- تموز - ۴
۳- کسلیو - ۹	۷- نیسان - ۱	۱۱- آب - ۵
۴- تبت - ۱۰	۸- ایار - ۲	۱۲- ایلول - ۶

یہودی مہینے اگرچہ قمری تھے، لیکن ہر دوسرے تیسرے سال مخصوص عہدے دار سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔[4] یہ اضافہ جس سال ہوتا، اس میں ماہِ "آدار" کے بعد ایک مہینہ بڑھا دیا جاتا جس کو "وَادَار" کہتے تھے[5] (دوسرا آدار)

ماہِ تشری کی ابتدا آج کل اسی رُویتِ قمر سے تسلیم کی جاتی ہے، جو ۵ ستمبر سے لے کر ۵ اکتوبر تک

---

[1] مسعودی التنبیہ والاشراف/۲۰۲، ۲۰۴، نیز دیکھئے طبری ۲/۲۵۳، طبری ۱/۹۸ [2] طبری ۱/۹۸

[3] BIBLE DIE BY SMITH VOL II 416

[4] ENCY OF ISLAM VOL III 8561 'TALMUD TRACT SANHADRIN-P. 11 نیز دیکھئے

[5] BIBLE DICTIONARY VOL II P. 416

ہوتی ہے۔[1] گویا تشری ہمیشہ اعتدالِ خریفی میں رہتا ہے۔

یہودیوں کی طرح عرب کے مسیحی قبائل میں بھی ایک علیحدہ سنہ رائج تھا۔[2] جو خالص شمسی تھا، اُس سنہ کے مہینوں کے نام اگرچہ یہودی تقویم سے حاصل کیے گئے تھے، لیکن طریقۂ تقویم رومی (JULME) اختیار کر لیا گیا تھا، اور مہینے بجائے رویتِ قمر کے جولین حسابات سے شروع ہوتے، سنہ کی ابتدا بجائے جنوری کے اکتوبر سے کی جاتی تھی، ذیل میں اس سنہ کے مہینوں کے نام دیئے جاتے ہیں، جو مصر و شام میں آج تک رائج ہیں۔

۱- تشرین اول - اکتوبر	۵- شباط - فروری	۹- حزیران - جون
۲- تشرین آخر - نومبر	۶- آدار - مارچ	۱۰- تموز - جولائی
۳- کانون اوّل - دسمبر	۷- نیسان - اپریل	۱۱- آب - اگست
۴- کانون آخر - جنوری	۸- اَیار - مئی	۱۲- ایلول - ستمبر

ان کے علاوہ متعدد قبائل میں کچھ اور سنین بھی رائج تھے، جن کے نہ صرف مہینوں بلکہ دنوں تک کے

---

[1] دیکھئے CHAMBERS' ENCYCLOPADIA VOLP لیکن البیرونی نے آثار الباقیہ/۱۴۱ (سخاؤ) میں بیان کیا ہے کہ یہودی سال کی ابتدا ایسے چاند سے ہوتی جس کی رویت ۲۷ آب (اگست) سے لیکر ۲۴ ایلول (ستمبر) ممکن ہوتی، تاریخی نقطۂ نظر سے البیرونی کی یہ شہادت بظاہر نہایت اہم ہے اور اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم البیرونی کے زمانے میں یہودی سال ۲۷ اگست سے شروع ہو سکتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ شاید ایران اور عراق کے یہودیوں تک محدود تھا، جہاں فصلیں پہلے تیار ہو جاتی ہیں، ورنہ شام اور فلسطین کے یہودی اس تاریخ سے ابتدا نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ فلسطین میں جَو کی فصل وسطِ اپریل سے پہلے تیار نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے عید فسح کا تیوہار جو ساتویں مہینے (یعنی نیسان) کی ۱۴ تاریخ کو ہمیشہ منایا جاتا اپریل کے لگ بھگ ہونا چاہیے، چنانچہ جوزیفس (JOSIPHOS) نے یہودی ماہِ نیسان کو مقدونی مہینے "X ANTHECUS" اور مصری مہینے "PHARMUTH" سے مطابقت دی ہے۔
دیکھئے JOSIPHOS ANT III 10:5 -

[2] SMITH BIBLE DIC VOL ii P. 417 مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے طبری ۱/۹۸

نام جُدا جُدا تھے،[1] اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ظہورِ اسلام کے وقت ملکِ عرب میں کوئی ایک ایسا مرکزی سنہ موجود نہ تھا، جس پر سب کا مدار ہو، پھر جن مقامات پر مخصوص سنہ رائج تھے، وہاں بھی جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

مثلاً ایک زمانے میں اہل مکہ بنائے کعبہ سے شمار ایام کیا کرتے تھے، پھر بخت نصر کے حملے سے حساب لگایا جانے لگا، جس کو عام التفرق کہا جاتا تھا، اس کے بعد عام الغدر[2] جاری کیا گیا۔ اور سب سے آخر میں "عام الفیل" کی بنیاد ڈالی گئی، چنانچہ سنہ ہجری کی ابتدا[3] تک مکہ میں یہی سنہ رائج تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سنہ محض مکے یا اُس کے قرب وجوار کے لئے مخصوص تھے اور صرف مقامی دینی حیثیت رکھتے تھے، اور کم از کم مدینے میں مہاجرین کے آنے سے پہلے رائج نہ تھے، چنانچہ مسعودی کے بقول اہلِ مدینہ میں یہ دستور رہا کہ وہ اپنے اَطام[4] سے — یعنی ان قلعوں یا گڑھیوں سے جو جنگ کی غرض سے بنائی جاتیں، شمارِ ایام کرتے تھے۔

مسعودی کی اس شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مکے اور مدینے میں قطعی طور پر دو سنہ رائج تھے، اور دونوں شہروں میں شمارِ ایام کے طریقوں میں بَیِّن فرق تھا، بنا بریں میں پہلے مکی، تقویم کی بازیافت کی کوشش کروں گا، اور بعد ازاں مَدَنی کلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کیا جائے گا۔

اہلِ مکہ کا نظامِ سنی تمام قدیم قوموں میں ماہ وسال کا انحصار محض چاند کی رُؤیتوں پر تھا، یہی وجہ ہے، کہ تقریباً تمام زبانوں میں مہینے کے لئے جو لفظ ملتے ہیں اُن سب کا تعلق چاند سے ہے، مثلاً فارسی لفظ "ماہ" اور ہندی مہینہ چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اسی طرح انگریزی لفظ (MONTH) لاطینی (MENSIS) جرمن (MOND) اور (MONAT) اور سنسکرت کے ماسہ (मास) کا تعلق چاند ہی سے ہے۔[5]

---

[1] البیرونی آثار/۷۴، ۷۵، نیز دیکھئے ابن سیدہ ۹/۴۲، طبری ۱/۹۸

[2] ابن حبیب/۶، ۷ [3] طبری ۲/۲۵۳ [4] التنبیہ والاشراف/۲۰۶

[5] DICTIONRY OF THE BIBLE .W. SMITH .VOL ii P. 415

یہ خصوصیت آریائی زبانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ سامی زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نظر نہیں آتیں، چنانچہ سال کے لئے عربی لفظ سنہ غالباً "سِنْ" (SIN) دیوتا کی یادگار ہے، جو تمام سامی قوموں میں چاند کا دیوتا شمار ہوتا تھا۔[1] اور قدیم بابلیوں میں اس کا لقب الٰہ الثلاثین (THE GOD THIRTY) تھا۔[2] جنوبی عرب میں سِن دیوتا کے نام کے حامل متعدد کتبے نکلے ہیں۔[3]

عربی زبان میں سال کے لئے دوسرا لفظ "عام" ہے، اس لفظ کا تعلق بھی چاند سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم عرب چندرماں دیوتا کو "عم" بھی کہتے تھے۔[4] اسی طرح لفظ تاریخ شاید "یرخ" سے بنا ہے جو فلسطین میں چاند کو کہا جاتا تھا۔[5] سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی لفظ "شہر" جس کے معنی آج بھی مہینے کے ہیں، قدیم آرامیوں میں، چندرماں دیوتا کا نام تھا، اور جنوبی عرب میں چاند کے لئے عام طور سے استعمال ہوتا تھا۔[6]

حقیقت یہ ہے کہ قدیم انسان کو زمانے کا ادراک ہوا۔ تو اُس کو سورج کے طلوع اور غروب کے بعد وقت کی سب سے بڑی اکائی جو ملی، وہ صرف چاند کی مقررہ اوقات پر رویت ہی تھی، جو ایک مدت یا وقفے کے گذرنے، اور دوسرے کے شروع ہو جانے کا، گویا ایک قدرتی اعلان تھا، ابتداءً یہی چھوٹا سا وقفہ تمام انسانی ضروریات کے لئے کافی تھا، لیکن انسانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ وقت کا یہ دائرہ تنگ تر ہوتا چلا گیا،

---

[1] THE RELIGION OF THE SEMETES . W.R. SMITH P. 532, 659

THE RELIGION OF THE ANCIENT WORLD G. RAWLINSON P. 59. 61

ENCYCLOPAIDIA OF THE RELIGION AND ETHICS VOL P.

ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL I P. 379 : خاص عربوں کے لئے دیکھئے

[2] CHALIDIA RAGAZIN P. 240

[3] ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL I 379

[4] / BIDE P. 379, 380

[5] DIC OF THE BIBLE 415 طبری اور البیرونی نے لفظ تاریخ کا رشتہ فارسی لفظ "ماہ روز" سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، اُن کا بیان ہے کہ "ماہ روز" سے مورخ بنا اور "مورخ" سے تاریخ وغیرہ۔ طبری۔

[6] ARTHUR JEFFERY (FOREIGEN VOCABULARY P. 187)
نیز دیکھئے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۰۶۔

اور ایک وقت ایسا آیا کہ اب انسان کو شمارِ ایام کے لئے اس سے بڑے وقفے کی ضرورت تھی،

مسلسل تجربات نے ہمارے اَجداد پر یہ بات واضح کردی تھی، کہ چاند جب بارہ ۱۲ مرتبہ نمودار ہوکر غائب ہوجاتا ہے تو موسم پھر عود کرنا شروع کردیتے ہیں، اس لئے بارہ ۱۲ قمری مہینوں کا یہ وقفہ ایک سال فرض کرلیا گیا۔ اور اس طرح شمارِ ایام میں ایک سہولت پیدا ہوگئی، بیان کیا جاتا ہے کہ سال کو بارہ ۱۲ ماہ[1] اور ہر مہینے کو چار ہفتوں پر سب سے پہلے وَادیٔ فرات کے سامی باشندوں یعنی کلدی بابلیوں (CHALDS BABYLONIANS) نے تقسیم کیا تھا،[2] اور ان ہی لوگوں نے ہفتے کے دنوں اور بروج شمسی کے نام رکھّے تھے، ہفتے کے سات دن شاید اس لئے مقرر کئے گئے تھے،[3] کہ یہ وقفہ چاند کی ماہانہ گردش کا ایک چوتھائی حصّہ ہے، یعنی (7 × 4 = 28) اور شاید اسی حساب کے رُو سے عربوں نے منازل قمر کی تعداد بھی اٹھائیس ۲۸ قرار دی تھی[3]

چونکہ ایک قمری مہینہ از رُوئے حساب (29·53) دن کا ہوتا ہے، اس لئے بارہ قمری مہینے یا ایک قمری سال (29·53 × 12 = 354·36) دن کا ہوا، لیکن فصلوں اور موسموں کا انحصار گردشِ قمر پر نہیں بلکہ سورج کی اُس ظاہری گردش پر ہے جو (365·24) دن میں تمام ہوتی ہے، اِس بنا پر موسمی اعتبار سے، سورج اور چاند کی سالانہ گردشوں میں (10·88) یعنی تقریباً گیارہ دن کا فرق رہتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کمی ایّام کے باعث قمری مہینے موسموں کا ساتھ نہیں دے سکتے، جس کو پورا کرنا قدیم قوموں کے لئے اشد ضروری تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ قدیم میں ہر قوم کے مذہبی تیوہار اگر ایک طرف

---

[1] تعجب ہے کہ رومیوں میں ابتداءً صرف ۱۰ قمری مہینوں کا سال ہوتا، یعنی مارچ سے لے کر دسمبر تک۔ (دیکھئے CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL ii, 641) اس بات کا اندازہ ستمبر، اکتوبر نومبر اور دسمبر کے ناموں سے بھی ہوتا ہے "SEPT" سات "OCT" آٹھ "NOV" نو "DEC" دس۔

[2] — RAGOZIN – CHALIDIA P. 230, 256

[3] بعض علماء کا خیال ہے کہ ہفتے کے سات دن سبع سیارگان کی مناسبت سے مقرر کئے گئے تھے، یہ خیال اس حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام بلاشبہ سیاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں، مگر جہاں تک تعداد کا تعلق ہے یہ خیال شاید صحیح نہیں کیوں کہ قدماء نے کرۂ فلکی کو ٹھیک اٹھائیس منازلِ قمر پر تقسیم کیا تھا، اس اعتبار سے ہفتہ دائرۂ فلکی کا ٹھیک ۱/۴ ہے۔

مخصوص مہینوں میں مقرر کئے جا چکے تھے، تو دوسری طرف یہ بات بھی فرائض دینی میں داخل تھی، کہ زائرین جب دیوتاؤں کے پاس حاضر ہوں تو اپنی زرعی اور حیوانی پیداواروں کے اوّلین حاصل بھی پیش کریں[1] اس بنا پر تیوہاروں کے متعین کرنے میں یہ خیال ناگزیر تھا کہ وہ ہمیشہ فصلوں' اور موسموں' سے مطابقت کرتے رہیں، تاکہ یاتری بہ آسانی نذرانے لا سکیں -

اِس سلسلہ میں ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ محض فصلی مشاہدات کے ذریعہ تعیّنِ ماہ کر دیا جائے۔ اور مہنت یا پروہت کچھ عرصہ پہلے اعلان کر دیں کہ تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ اس کے مراسم اجتماعی طور پر ادا ہو سکیں، چنانچہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقۂ کار بھی بڑے عرصہ تک جاری رہا،

البیرونی نے یہودیوں کے ایک فرقے کے متعلق بیان کیا ہے، کہ ان میں عید فسح کا تیوہار منانے کے لئے یہ دستور تھا، کہ ایک مُتدیّن عالم ۲۳ر شباط کو شہر سے باہر جاتا اور جَو کے کھیتوں کا معائنہ کرتا اگر جَو کی بالوں میں نوکیں نکل آتیں، تو اُس تاریخ سے پچاس دن شمار کر کے عید فسح کا تیوہار مقرر کر دیتا۔ ورنہ سالِ رواں میں ایک ماہ کا اضافہ ضروری تھا[2]

ظاہر ہے کہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقۂ کار جیسا کہ خود البیرونی کا خیال ہے مقامی اور غیر مرکزی معبدوں کے لئے جتنا آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے، مرکزی معبدوں کے لئے جہاں دُور دُور سے یاتری

---

[1] مثلاً یہودیوں میں آج تک دستور ہے کہ ماہِ نیسان میں یعنی پہلے مہینے کی چودھویں تاریخ زوالِ آفتاب اور غروب کے درمیان عید فسح منائی جاتی ہے، جس کے لئے بائبل میں یہ حکم ہے: "تم اپنے غلّے کے پہلے حاصل میں سے ایک پولا کاہن کے پاس لاؤ اور وہ اپنے خداوند کے حضور ہلاوے تاکہ وہ تمہاری طرف سے قبول ہو (احبار ۲۳ : ۴ تا ۱۰، ۱۲)

خود عربوں میں چندر مان دیوتا (عمی انس = عمیانس) کو ظہور اسلام کے وقت تک بھینٹیں دی جاتی تھیں، ابن کلبی نے صراحت کی ہے کہ قرآن مجید کی آیات ...." وجعلوا للہ مما ذرا من الحرث والانعام نصبا فقالوا ھذا للہ بزعمھم وھذا لشرکائنا" سے مقصد عمیانس کے لئے بھینٹیں ہیں، یقسمون لہ من انعامھم وحروثھم قسماً بینہ وبین اللہ" کتاب الاصنام/ ۴۳ نیز دیکھئے یاقوت ۶/ ۲۲۷

[2] آثار الباقیہ البیرونی/ ۶۹

نیز دیکھئے۔ DIC OF BIBLE (SMITH) VOL ii P: 416

آتے، اُتنا ہی دشوار اور نا قابلِ عمل بھی تھا، کیوں کہ ہر سال پجاریوں اور پروہتوں کو دُور دراز مقامات تک اعلان کرانا اور اطلاعیں بھیجنا کچھ سہل کام نہ تھا، ضرورت یہ تھی کہ ایک سال قبل عین مندر یاترا کے وقت جبکہ جملہ زائرین موجود ہوں، اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اگلے سال تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ یاتری ٹھیک وقت پر یاترا کے لئے آسکیں۔

اس مقصد کے لئے ایک دوسرا طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاسکتا تھا، کہ ہر تیسرے سال مستقل طور پر ایک ماہ کا اضافہ ہوتا رہے، کیونکہ تین شمسی سالوں کے دن (1096) ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں تین قمری سال اور ایک ماہ کے دن (1093) ہوں گے، گویا سال میں صرف ایک دن کا فرق پڑے گا، جو ابتداءً قطعی طور پر غیر محسوس ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرق بڑھتے بڑھتے کچھ ہی عرصہ میں مہینوں اور سالوں کا ہو جائے گا۔ اور صرف تیس[۳۰] سال میں پورے ایک مہینے کا فرق موسموں کو پھر منحرف کر دے گا جس کے لئے نئے سرے سے اقدامات کی ضرورت ہوگی۔

"میور" (MUIR) کا خیال ہے کہ اہلِ مکہ میں یہی طریقہ رائج تھا، اور اسی وجہ سے ظہورِ اسلام کے وقت تک موسموں میں تقریباً چھ[۶] ماہ کا فرق پڑ چکا تھا۔[۱]

اس کے مقابلے میں ایک تیسرا طریقہ یہ اختیار کیا جاسکتا تھا کہ ہر آٹھ قمری سالوں میں تین[۳] ماہ کا اضافہ کر دیا جائے، جس سے نتائج میں کم فرق پڑتا ہے، کیوں کہ آٹھ قمری سال اور تین قمری ماہ کے دن (2923) ہوتے ہیں، اور آٹھ شمسی سالوں کے دن تقریباً (2922) ہوں گے گویا آٹھ سال میں تقریباً ڈیڑھ دن کا فرق (1.55) رہتا ہے، "البیرونی" کا خیال تھا کہ اہلِ مکہ اسی طریقے پر کاربند تھے۔[۲]

اِس سلسلے میں سب سے صحیح طریقہ وہ تھا، جو اہلِ یُونان نے دریافت کیا تھا، بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تقریباً سنہ ۴۳۲ ق م میں ایک یونانی ریاضی داں میٹون (METON) نے علمی طور پر یہ اکتشاف کیا کہ 235 قمری مہینے یعنی ۱۹ قمری سال اور سات ماہ، پورے اُنیس[۱۹] شمسی سالوں کے برابر ہوتے ہیں۔[۳]

---

[۱] MUIR - Life P. cii [۲] البیرونی کا بیان ہے کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس سال میں نو ماہ کا انضمام کرتے تھے۔ جس کے یہی معنی ہوتے ہیں کیوں کہ (3×3=9) اور (8×3=24) دیکھئے آثار الباقیہ/۱۲

[۳] CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL = iii P. 226
I BID VOL: V 285

اس لئے اگر اُنیس[19] قمری سالوں میں سات قمری مہینوں کا انضمام کر دیا جائے، تو شمسی اور قمری سالوں کی تعدادِ ایام میں صرف برائے نام فرق رہے گا۔

اِس ۱۹ سالہ دَور کو جس میں 235 قمری مہینے ہوتے ہیں اصطلاحاً میٹنی دَور (METONIC CYCLI) کہا جاتا ہے، یہ اصول چوں کہ عملاً سادہ اور فلکی مشاہدات کے اعتبار سے بڑی حد تک غیر فنّی تھا، اس لئے خوب مقبول ہوا، اور نہ صرف یونان بلکہ تمام مشرقِ وسطیٰ میں جہاں جہاں بھی قمری سنہ رائج تھے، بحیثیتِ اصول تقویمی تسلیم کر لیا گیا، حتیٰ کہ یہود جیسی قدامت پسند قوم نے بھی اپنا لیا، چنانچہ البیرونی کے بقول شام و عراق کے یہودی اسی طریقے پر کاربند تھے[1]

اِن حسابی اصولوں کے علاوہ زمانۂ قدیم میں ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا، کہ محض فلکی مشاہدات پر تقاویم کی بنیاد رکھی جاتی، اور شمارِ ایام میں بُروجِ شمسی اور منازلِ قمر (نچھتروں) سے مدد لی جاتی تھی، جیسا کہ ہندوستان میں آج تک دستور ہے، لیکن یہ طریقہ غالباً صرف ستارہ شناس قوموں تک محدود تھا، کیوں کہ اس میں پورے نجومی اِدراک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ طریقے ابتداءً صرف اس لئے اختیار کئے گئے تھے، کہ مندروں کی مذہبی حکومتیں اپنی سالانہ آمدنی کو جو زرعی بھینٹوں اور چڑھاوؤں کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی، بہر صورت برقرار رکھنا چاہتی تھیں اور اس بات پر مجبور تھیں، کہ ہر دوسرے تیسرے سال تیوہاروں کو تعویق یا تاخیر میں ڈال دیا جائے، تاکہ فصلیں تیار ہو سکیں، اس مقصد کے لئے انھیں ہر دوسرے تیسرے سال ایک "لَونَد" کا مہینہ بڑھانا پڑتا، تاکہ قمری سال فصولِ شمسیہ سے تجاوز نہ کرنے پائیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ "کَبیسَہ" سالوں کے تعیّن یا اعلان میں عوام النّاس کی رائے کو کوئی دَخل نہ تھا، بلکہ اس مقصد کے لئے مَندروں کی مذہبی حکومتوں نے علیٰحدہ محکمے قائم کر رکھے تھے، جن کے فیصلے اٹل ہوتے۔

رُومیوں میں جُولیَس سیزَر (JULIUS CAESER) کے عہد تک یہ اختیار چند ہاتھوں تک

---

[1] آثارالباقیہ سخاؤ/۱۴۲ - نیز دیکھئے SMITH BIBLE DIC VOL ii, P. 416

(یہودیوں نے یہ طریقہ ۳۶۰ء میں قبول کیا تھا)

محدود رہا، جو اکثر و بیشتر اپنے عہدے اور اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاتے، اور بالعموم ایسا ہوتا، کہ کسی خاص شخص سے انتقام لینے کے لئے یا کسی دوست کے فائدے کو مدنظر رکھ کر سال کو گھٹا بڑھا دیا جاتا[1] ان بے عنوانیوں کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد موسموں اور مہینوں میں سرے سے کوئی مطابقت نہ رہی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جولیس (JULIUS) کے زمانے میں ایک بار موسم بہار کے تہوار، موسم گرما میں جا پڑے جس کی بنیاد پر قیصر نے اس تقویم پارینہ کو روم سے ہمیشہ کے لئے ملک بدر کر دیا[1]۔ اور نئی تقویم کے اجراء کا اعلان کیا، جس کا قمری مہینوں سے کوئی تعلق نہ تھا، موجودہ مسیحی سنہ اسی جولین سنہ کی یادگار ہے، اور جولائی کا مہینہ قیصر کے نام پر آج تک چلا آرہا ہے۔

یہودیوں میں بھی سالوں کو کبیسہ قرار دینے یا نہ دینے کا کام ہمیشہ مخصوص ہاتھوں میں رہا اور بجز ناشی (NASHI)[2] کے جو اُن کا سب سے بڑا عالم دین ہوتا، کسی بھی دوسرے شخص کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کبیسہ سالوں کے تعین کے متعلق کوئی رائے زنی کر سکے، صرف ناشی (NASHI) ہی کو تمام تر اختیارات تھے، کہ اعلان کبیسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، واضح رہے کہ بائبل (BIBLE) میں کبیسہ کا کوئی ذکر نہیں، اور سال کے صرف بارہ[12] مہینے مذکور ہوئے ہیں[3]۔

عربوں میں ظہور اسلام تک تعین کبیسہ کا محکمہ بنو کنانہ کے ایک خاندان میں موروثی چلا آرہا تھا۔ جس عالم کے سپرد یہ خدمت ہوتی، اُسے "قلمس" یا "ناسی" کہا جاتا تھا[4]، یہ لوگ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے[5]۔ اور ان کے تمام فیصلے بالکل اٹل ہوتے، کسی بھی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ ان کے تفضایا کو رَدّ کر سکے، "نُساة" عرب کی بے عنوانیوں اور اپنے اختیارات تمیزی

---

[1] CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL ii P. 641

[2] TALMUD TRACT SAMHEDRIN P. 11 ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL III P. 856

[3] BIBLE DICTIONARY SMITH MOUTH

[4] .... ویتولی ذالك النساۃ من کنانۃ المعروفون بالقلامیس واحدهم قلمس وهو البحر العزیز وهم ابو ثمامہ جنادۃ بن عون بن امیہ بن قلع بن عباد بن قلع بن حذیفہ وکانوا کلهم نساۃ۔ آثار الباقیہ/۱۲

[5] دیکھئے ابن حبیب۔

کے غلط استعمال کا گلہ نہ صرف اوراقِ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، بلکہ قرآن نے اس شکوہ کو حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، (یحلونہ عاماً و یحرمونہ عاماً) [1]

یہی وہ "نساۃ" تھے، جن کے ہاتھ میں اہلِ مکہ کا پورا انتظام تقویم تھا اور یہی قمری ایام کو شمسی ایام میں تبدیل کر کے، ایامِ حج اور زیارت بیت اللہ کا زمانہ متعین کرتے تھے،

قمری شمسی تقویم کی بالکل ابتدائی غرض یہ ظاہر کی جا چکی ہے، کہ مرکزی معبدوں پر ہدایا اور فصلی نذرانوں کی آمد میں دشواریاں نہ ہوں، اور تمام اہم تیوہار فصلوں اور موسموں سے مطابقت کرتے رہیں تاکہ مندروں کی سالانہ آمدنی بحال رہے۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبے کا معبد دنیا کے قدیم ترین معبدوں میں سے ایک تھا، عربوں کا دعویٰ تھا کہ اس کی بنیاد (تقریباً دو ہزار ۲۰۰۰ قبل مسیح میں) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی، اس دعوے کی تائید قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی ہوتی ہے [2]۔ اور اگرچہ اس تصور سے بعض یورپی علماء کو انکار ہے [3]۔

تاہم کچھ صدائیں اس کی موافقت میں بھی بلند ہوئی ہیں، راڈویل (RODWELL) نے آیات (۲ : ۱۲۷ وغیرہ) کی تشریح کرتے ہوئے ایک مستند مصنف کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ "اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی بھی معقول وجہ نہیں، کہ کعبے کی بنیاد اس طرح پڑی تھی، جس طرح قرآن نے بیان کی ہے [4]"

اس دعوے سے قطع نظر، مختلف شہادتوں سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کعبے کے معبد کی تاریخ سنہ عیسوی سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، ہیروڈوٹس (HERODOTS) نے جو چوتھی صدی قبل مسیح کا مصنف ہے، "کعبے" کے بعض معبودوں کا تذکرہ کیا ہے [5]، ڈائڈورس (DIODORUS SICULUS) نے سنِ عیسوی سے تقریباً پچاس سال پہلے اس عظیم مرکزی معبد کا پتہ دیا ہے [6] جس کی بنیاد پر

---

[1] قرآن : ۹ : ۳۸ [2] قرآن : ۲ : ۱۲۷ [3] MUIR - LIFE P. cii

[4] RODWELL - QURAN P. 351

[5] MUIR - LIFE P. cii , ciii [6] I. BID - ciii

میور (MUIR) اور پالمر (PALMER) وغیرہ کعبے کی قدامت پر استدلال کرتے ہیں، بہرصورت یہ سب کو تسلیم ہے، کہ مکّے کا یہ مشہور معبد ظہورِ اسلام سے بہت پہلے پورے عرب کا مرکزی مندر بن چکا تھا اور جن ایام میں یہاں سالانہ اجتماع ہوتے، تو پورا عرب ان کے احترام میں ہتھیار کھول دیتا۔ مسلسل تین مہینے ہر قسم کی خوں ریزیاں رُک جاتیں[۲] اور عرب کے گوشے گوشے سے حاجی یہاں پہنچنا شروع ہوجاتے،

اَپی فینس (EPIPHENNAS) عربی تقویم کے ایک مہینے کا نام "AGGATHUL BAITH"[۳] بیان کیا ہے جو غالباً ذوالحجہ کی ایک شکل ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہاں اطراف واکناف سے زائرین آتے اور تحائف لاتے، جن کے لئے سازگار موسموں کی ضرورت تھی، بلکہ میور (MUIR) کے خیال کے بموجب خود ان زائرین کی غذائی ضروریات[۴] کے لئے فصلوں اور موسموں کا لحاظ ناگزیر تھا، اس بنا پر ظاہر ہے کہ یہاں شمسی تقویم کے بغیر چارہ نہ تھا، جو معلوم ہوتا ہے، کہ رفتہ رفتہ اجرامی پرستش میں تبدیلی ہوتی چلی گئی، اور جس کو بالآخر قرآن نے کفر میں زیادتی کا موجب قرار دے کر ختم کردیا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

"بیشک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں "یوم خلق السمٰوٰتِ والارض" کے مطابق ۱۲ مذکور ہوئی ہے، جس میں سے چار حرام مہینے ہیں۔

یہی قائم رہنے والا دین ہے، سو اِن مہینوں میں آپس میں ظلم نہ کرو.....

بلاشبہ "نسی" کا مہینہ کفر میں زیادتی کا موجب ہے، اس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں علاوہ ازیں کسی سال اس کو حرام مہینہ قرار دیتے ہیں اور کسی سال اس کو حلال کردیتے ہیں

---

۱ MARGOLIOUTH - RISE P. 5 ۲ - PALMER QURAN P XVI

۳ ENCYCLO PAEDIA OF - ESLAM - HAJJ " P. 200

اگرچہ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ مہینہ کسی شمالی معبد کے حج سے متعلق ہوگا۔

۴ MUIR - LIFE P. Cii

"تاکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حرام مہینوں کی تعداد میں موافقت پیدا کریں، سو اِس مہینے کو حلال قرار دیتے ہیں، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔"

اِن آیات کی تشریح میں اگرچہ بعض علمائے اسلام نے جو شاید اصولِ کبیسہ سے واقف نہ تھے، لفظ "نسی" کی ایسی تشریحات کی ہیں، جن سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ صرف حرام مہینوں کے حلال کردینے کا ایک عجیب وغریب طریقہ تھا، جو جاہل اور وحشی عربوں نے محض غارت گری کے لئے نکال لیا تھا، لیکن امام رازی نے آیاتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے جو اقوال لکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قریب الفہم یہ ہے:-

..... لوگوں نے یہ بات جان لی، کہ وہ اپنا حساب قمری سنہ پر مرتب کریں گے، تو حج کبھی گرمی میں جا پڑے گا اور کبھی سردی میں اور حاجیوں کے لئے سفر باعثِ مشقت تھے، اور وہ اُن سے کاروبار اور تجارت میں اس لئے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، کہ دوسرے شہروں کے لوگ ایسے ہی اوقات میں آسکتے تھے، جو اُن کے لائق اور موافق ہوں، اس لئے انھوں نے یہ سمجھ کر کہ معاملے کی بنیاد قمری سنہ پر رکھی جائے تو یہ دُنیوی مصالح کے خلاف ہوگا، اس کو ترک کردیا اور سالِ شمسی کا اعتبار کرنے لگے، چوں کہ شمسی سال قمری سال سے ایک معین مدت کے بقدر زائد ہوتا ہے، اِس بنا پر "لَوند" کی ضرورت پڑی اور اس لَوند کے باعث انھیں دو باتیں حاصل ہوئیں۔

(۱) یہ کہ انھوں نے بعض سالوں کو اِس بڑھوتری کو کھپانے کے لئے "۱۳" ماہ کا قرار دیا۔

(۲) یہ کہ حج بعض قمری مہینوں سے دوسرے مہینوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

(تفسیر کبیر ص ۴۳۴-۴۳۵)

اِس تشریح سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اِن آیات کے نزول کے وقت تک (یعنی ۹ھ تک) اہلِ مکّہ میں یہ طریقہ رائج رہا، کہ وہ حسبِ ضرورت سال میں ایک ماہ کا اضافہ کرکے اپنی قمری تقویم کو شمسی حسابات کے مطابق کرلیا کرتے تھے، جس سال یہ اضافہ ہوتا، وہ سال بجائے بارہ مہینے کے تیرہ ۱۳ مہینے کا شمار کیا جاتا، جس کی ممانعت کا اعلان بعد میں قرآن مجید نے ان الفاظ میں ضروری سمجھا:-

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں مہینوں کی تعداد صرف ۱۲ ہے"[1]

البیرونی نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، کہ عربوں کا یہ طریقہ بعض ایسے حسابات فلکی پر مبنی تھا، کہ جب قمری سال شمسی سال سے بقدر ایک ماہ چھوٹا ہونے کو آتا، تو اس میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے پھر شمسی بنا لیا جاتا۔

"اور زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ اس بات پر نظر رکھتے تھے، کہ ان کے سال اور شمسی سال میں کیا فرق ہے؟ جو از روئے حساب دس دن اکیس[21] گھڑی اور پانچ پل کا ہوتا، اور جب وہ ایک ماہ کے بقدر ہو جاتا، تو وہ اپنے سنہ میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیتے، لیکن یہ عمل اس مفروضے پر کرتے تھے، کہ فرق دس دن اور بیس گھڑی کا ہے اس کام کی انجام دہی قبیلہ کنانہ کے "نُسّاۃ" جن کو قلامس کہا جاتا تھا کرتے تھے۔"[2]

البیرونی کے علاوہ دوسرے مؤرخین اور علمائے اسلام نے بھی عربوں کے طریقۂ نسی کی بہت کچھ وضاحتیں کی ہیں، جن کا تذکرہ میں بعد میں کروں گا، یہاں مجھے البیرونی اور البیرونی کے بعض مُتتبّعین کی ایک خاص تاریخی غلطی کی طرف اشارہ کرنا ہے، البیرونی کا خیال تھا کہ اہلِ مکہ نے ظہورِ اسلام سے تقریباً دو[200] سو سال پہلے یہ طریقہ یہودیوں سے سیکھا تھا[3]، چنانچہ میور (MUIR) نے شاید اسی خیال کو قبول کر کے اس پر اتنا اور اضافہ کر دیا کہ اہلِ مکہ بالالتزام ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری ایام کی کمی پوری کر لیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں، ان کا سال شمسی سال کے مقابلہ میں بقدر ایک یوم چھوٹا رہتا۔[4]

یہ دونوں خیال تاریخی نقطۂ نظر سے بالبداہتہ غلط معلوم ہوتے ہیں، البیرونی کا قول تو خود آثار الباقیہ کی تصریحات سے غلط ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا، تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ ان دونوں کے طریقہ حساب

---

[1] ۹ : ۳۶ [2] آثار الباقیہ/۱۲

[3] البیرونی کا قول ہے: "وکان اخذ ذالك من الیهود قبل ظهور الاسلام تقریب من مائتی سنہ" آثار الباقیہ/۱۲ نیز دیکھیے قانون مسعودی/۹۲ [4] MUIR. -LIFE cii

میں بھی مشابہت تھی، اور یہ دونوں ایک ہی اصول پر مبنی تھے، حالانکہ خود البیرونی نے اس بات کی صراحت کی ہے، کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس ۲۴ سال میں نو ماہ کا اضافہ کرتے تھے[1] جبکہ یہودیوں میں ہر انیس ۱۹ سال میں سات ماہ کے اضافے کا دستور تھا۔[2]

رہا میور (MUIR) کا خیال کہ عرب ہر تیسرے سال (بلا کسی حسابی الجھاؤ کے) ایک ماہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے، تاریخی اعتبار سے بالکل بے سند ہے، بلکہ اوراقِ تاریخ میں اس کے خلاف پیہم شہادتیں ملتی ہیں (جن کو آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے) یہاں البیرونی کی یہی شہادت کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس ۲۴ سال میں نو ۹ ماہ کا اضافہ کرتے تھے، پیش کی جا سکتی ہے۔[3]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے، کہ عربوں نے اپنا طریقہ نسی یہودیوں سے حاصل کیا تھا، جو نہ صرف عربوں میں بلکہ خود یہودیوں میں بھی ظہورِ اسلام کے وقت تک بے قاعدہ حسابات پر مبنی تھا۔[4]

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے متعلق ہمارے بعض علماء کا یہ تصور کہ وہ قطعاً جاہل اور ابتدائی علوم تک سے بے بہرہ تھے، اِس بات کی اجازت نہیں دیتا، کہ تاریخی مسائل کو حل کرتے وقت بھی اس کو نظر انداز کر دیا جائے، چنانچہ مستشرقین سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی، اور عرب جاہلیت کے تمام تر نجومی تصورات جن کے حوالے اوراقِ تاریخ میں جگہ جگہ بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں[5] محض اس مفروضے پر نظر انداز کر دیئے گئے، کہ ان میں ذاتی طور پر صلاحیتِ تقویم موجود نہ تھی،

یہ اسی ابتدائی غلطی کا نتیجہ تھا، کہ علمائے یورپ اس معمولی مسئلہ (مسئلۂ تقویم کو) حل نہیں کر سکے، حالانکہ جاہلی روایات و آثار کی مدد سے یہ بات اس وقت بھی ممکن تھی، اور آج بھی ممکن ہے، اس بات کی

---

[1] ..... کانوا یکبسون کل اربع وعشرین سنۃ قمریۃ بتسعۃ اشھر" آثار الباقیہ/۱۲

[2] آثار الباقیہ صفحہ (SACHAW) ۱۲/ [3] آثار الباقیہ / ۱۲

[4] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL iii P. 856

[5] ENCYCLOPAEDIA OF RELEGION AND ETHICS P. 660

تردید کہ عربوں کا طریقہ النسی محض یہودیوں کی بے ضرر تتبع و تقلید پر مبنی تھا، خود قرآن مجید کے ان الفاظ سے ہو جاتی ہے:

"بلاشبہ نسی کفر میں زیادتی کا موجب ہے، ایک سال اس کو حلال کر دیتے ہیں اور ایک سال حرام" [1]

جس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ نسی کا یہ طریقہ کفر و شرک میں زیادتی کا موجب تھا، اور اس میں یہودیت کی بجائے اجرام پرستی کے عناصر اور مشرکانہ خیالات کو بڑا دخل تھا، جو اُس وقت پورے عرب پر چھائے ہوئے تھے،

جاہلی عربوں کی دینی تاریخ کے ابتدائی اوراق سے لے کر آخری سطور تک اِس بات کی شاہد ہیں کہ تمام سامی قوموں کی طرح ان میں اجرام سماوی کی پرستش کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل رہا ہے۔[2]

کتبات اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، کہ عرب چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل شعری (عثتار) نسر[3] حتیٰ کہ منازل قمر تک کی پرستش کرتے، ان کی عیدیں مناتے اور زرعی و حیوانی پیداواروں میں اُن کے حصے مقرر کرتے تھے،[4] تقریباً تمام بڑے بڑے معبود، آسمانی معبود تھے۔

لات[6]، مناۃ اور عزیٰ کی تثلیث غالباً اجرامی تثلیث تھی، ہبل شمسی دیوتا تھا،[7] سورج کی پرستش بڑے قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھی، جس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے، اسی طرح تقریباً سب کے سب مندر اجرام فلکیہ کے ہیکل ثابت ہوتے ہیں، بیتِ غمدان کو زہرہ کا ہیکل بتایا جاتا ہے۔[8]

---

[1] قرآن ۹: ۳۷ [2] خود سر ولیم میور کا یہی خیال ہے کہ عربوں میں صابیت یا ستارہ پرستی کا رواج نہایت قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا حتیٰ کہ ان کی رائے میں کعبے کا سات بار طواف اسی ستارہ پرستی کی سنت ہے۔ نیز ملاحظہ ہو

ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS P.P. 660 ARABS ANCIENT.

[3] ان سب کے لئے دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I ARABS

[4] کتاب الاصنام تکملہ احمد زکی پاشا [5] ایضاً ذکر عمیانس/۴۳ [6] ROBERTSAN SMITH 56

[7] ROBERTSAN SMITH RELIGION OF SMITIS

[8] ..... ومنها بيت غمدان الذى بمدينة صنعا اليمن بناه ضحاك على اسم الزهرة" شہرستانی/۴۳۲:

"ذوالخلصہ" اور طائف کا بیت اللات شمسی ماتا دیوی لات کا مندر تھا[1]۔ خود بنائے ابراہیمؑ یعنی کعبے کے متعلق یہ تصورات تھے کہ یہ حقیقتاً زحل کا ہیکل تھا، جس کو بانی اول نے مخصوص طوالع میں تعمیر کیا تھا[2]۔

قطع نظر اس سے نہایت ہی قدیم زمانے سے لے کر ظہور اسلام تک عربوں میں ادیان شمسیہ کے آثار جگہ جگہ پائے جاتے ہیں، قرآن مجید کی شہادت کے بموجب "ملکۂ سبا" آفتاب پرست تھی[3]۔ مورخین عرب قوم سبا کے مورث کا نام عبدالشمس بتاتے ہیں[4]۔ عہد رسالت تک بنو تمیم سب کے سب آفتاب پرست تھے[5] اور ان کے یہاں آفتاب کا ایک علیحدہ مندر بھی موجود تھا، "بنو اُدّ" بنو ضبۃ "عم"، عدی، عکل، اور ثور سب اس کی پرستش کرتے تھے[6]۔ اور شاید بنو اُدّ کا سلسلۂ نسب بھی سورج دیوتا سے ملتا تھا۔ کیوں کہ زمانۂ قدیم میں اُدّ (UD) سورج کو کہا جاتا تھا[7]، خود قریش کے مشاہیر اور اجداد میں "اُدّ" اور "عبدالشمس" جیسے نام ملتے ہیں۔

یونانیوں کا مشہور دیوتا "اپالو" (APOLO) تھا، جو سورج کا مظہر خیال کیا جاتا تھا، اُس کی ماں کا نام "لیٹو" (LETO) یا لیٹونا (LETONA) مشہور ہے، موجودہ زمانے کے علماء کا فیصلہ ہے کہ اِن دونوں دیوتاؤں کی اصلیت عرب ہے، جو ریگستانِ عرب سے سفر کر کے یونان پہنچے تھے[8]، ان علماء کی رائے میں اپالو (APOLO) "ہُبل" کی بگڑی ہوئی صورت ہے، اور لیٹو (LETO) لات کا یونانی تلفظ، مکّے میں اسی سورج دیوتا کی قیمتی مورتی جو عقیق سرخ کی بنی ہوئی تھی، عین خانۂ کعبہ میں سب سے

---

[1] لات کے لئے دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM - VOL iii P. 18 - RELIGION OF SMITES P. 520, 56

[2] ... "وبهذا نعرف كذب من قال ان بيت الله الحرام انما هو بيت زحل بناه البانی الاول علی طوالع معلومة واتصالات مقبولة وسماه بيت زحل" شہرستانی/۴۳۱ [3] قرآن، [4] ابن حبیب/۳۶۴

[5] ابن حبیب/۳۱۶ [6] M. RAGOZIN CHALIDIA P. 171 - [7] دیکھئے ابن خلدون/۱/۳۲۳

[8] ..... BUT WE MAY POINT OUT IN CONCLUSION THAT IN ALL PROBATUS THE GREEKS BORROWED FROM ARABIA AT AN CARLY PERIOD THRONGH SOUTH ARABIAN INCENCE MERCHENTS THERE APULLO AND HIS MOTHER LETO (LATINFORM) LOTONA - (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I P. 380

[9] یاقوت/۸/۴۴۳ - نیز دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM — VOL ii 327

بلند مقام پر رکھی تھی، اور اس کے جِلو میں لات، منات، عزّیٰ کی اجرامی مورتیاں نصب تھیں۔[1] ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ظہورِ اسلام کے وقت خود کعبہ "بیت اللہ" سے زیادہ "بیت الاجرام" بنا ہوا تھا۔

بخاری میں ہے کہ فتح مکّہ سے پہلے کعبے کے گرد (۳۶۰) مورتیاں نصب تھیں۔[2] ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عین مُطاف کے اندر تھیں، اور سیسہ پلا کر جمادی گئی تھیں،[3] جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ مورتیاں پتھر کی نہ تھیں بلکہ فلزی چھوٹے چھوٹے اصنام تھے، جن کو کعبے کے گِرد نصب کیا گیا تھا، اوّل تو یہ "۳۶۰" کا عدد جس سے خود بخود ہمارا ذہن، ایک دائرہ یا کرۂ فلکی کے "۳۶۰" درجات کی طرف منتقل ہوتا ہے (جس میں سورج کی گردش ہوتی ہے) دوسرے یہ کہ ان مورتیوں کے عین وسط میں "ہُبَل" یعنی سورج دیوتا کی مورتی کا ہونا، اس بات کی شہادت ہے، کہ غالباً ان سب کا تعلق دائرۂ فلکی ہی سے تھا، جو اجرام پرستوں کے طواف کے لیے ایک "مقدس نشانِ راہ" کا کام دیتے تھے،

ظہورِ اسلام کے وقت عربوں میں فلکیات کا درک اچھا خاصا نظر آتا ہے، چنانچہ ان کتابوں سے قطع نظر جن میں خاص طور پر اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، خود قرآن مجید سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ جاہلی عربوں میں نجومی اِدراکات بہ ہمہ وجوہ موجود تھے، اور اگرچہ اس مقدّس کتاب نے جاہلی عربوں کے علوم و فنون اور ارتقائے تہذیب و تمدن کے موضوع کو نہیں چھُوا ہے، تاہم جس طرح ہر کتاب میں اپنے عہد اور ماحول کی کچھ نہ کچھ عکاسی ہوتی ہے، اور ایسی باتیں آجاتی ہیں، جو اس زمانے میں بیشتر رائج اور متداول ہوتی ہیں، اسی طرح قرآن میں بھی بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں، جن کا تعلق جاہلی سماج کے علوم و فنون، اور تہذیب و تمدّن سے تھا، چنانچہ اپنے عہد کے علومِ فلکیہ کے متعدد حوالے قرآن میں موجود ہیں۔

---

[1] ابوعبیدہ کا بیان ہے۔ "کانت اللات والعزیٰ ومناۃ اصنامًا من حجارۃ فی جوف الکعبۃ" سیر الغرام ابن جوزی/۱۱۳

[2] بخاری / تجرید بیان فتح مکہ [3] ابن ہشام ۴/۵۹

مثلاً قرآن سے پتہ چلتا ہے، کہ عرب نہ صرف منطقۃ البروج سے واقف تھے[۱]، بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سورج اور چاند کس طرح حرکت کرتے ہیں[۲]؟ اور مستقر الشمس کہاں ہے[۳]؟ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ منجمین عرب سورج کے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں[۴]، یعنی سرمائی اور گرمائی مطلع سے واقف تھے، (گویا خطوط جدی اور سرطان کا انھیں علم تھا) سیاروں کی الٹی اور سیدھی رفتار[۵] (استقامت اور رجعت) سمجھنا مشکل ہے، مگر وہ سمجھتے تھے، آسمان پر سبع سیارگان کے مدار الگ الگ ہیں، ان مداروں سے عربوں کو پوری واقفیت تھی، اور غالباً اسی وجہ سے انھوں نے افلاک کی تعداد سات قرار دی تھی، جس کو "سبع طرائق[۶]" یعنی (سات راستے یا مدار) بھی کہا جاتا تھا، ان آسمانوں میں سے ایک کو ہماری زمین سے متعلق قرار دیتے تھے[۷] غالباً یہ بات بھی اُن کے علم میں تھی، کہ "کسوفِ شمسی" اجتماع نیرین[۸] کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مواقع النجوم[۹] یا دوسرے الفاظ میں اُن عقدوں سے بھی واقف تھے، جن سے خاص خاص ستارے شناخت کئے جاتے ہیں، علمِ نجوم کا آخری یا شاید پہلا شاہکار جنم کنڈلیاں[۱۰] اور زائچہ سازی ہے، عرب اِس معاملے میں بھی پیش پیش تھے، اور انسانی قسمتوں کو گردشِ افلاک سے وابستہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سمندر میں جہازرانی، اور صحرا میں شتربانی دونوں یکساں حیثیت رکھتی ہیں، اہلِ عرب ان دونوں کو سر کرنے میں "قطب" اور دوسرے تاروں سے مدد لیتے[۱۱]۔ منازلِ قمر یا انوائے فلکیہ کا علم تو شاید بہت ہی صحیح تھا، کیونکہ ہر شخص کی ضروریات اُن سے وابستہ تھیں، اور تقویم کا کُلیتہً مدار انھیں پر تھا[۱۲]۔

---

۱ قرآن: ۱۵: ۱۶، ۲۵: ۶۱، ۸۵: ۱، علمائے لغت کے نزدیک لفظ "بروج" برج سے مشتق ہے جس کے معنی "ظاہر ہونا" ہیں (دیکھئے بیضاوی نیز لسان العرب ۳/۳۳) لیکن بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اس کی اصل یونانی یا لاطینی "BURGUS" ہے جو فصیل شہر کے منارہ کو کہتے تھے (JEFFRY 78) اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی جاہلی علم ہیئت و نجوم پر یونانی اثرات موجود تھے، ۲ ۲۵: ۶۱ ۳ ۳۶: ۳۸- نیز دیکھئے کتاب الانواء ۴ ۵۵: ۱۷، نیز دیکھئے کتاب الانواء/۱۴۱- ۵ قرآن ۸۱: ۱۶ ۶ ۲۳: ۱۷ ۷ ۳۷: ۶ ۸ ۷۵: ۸، ۹ ۷۵: ۶۵ ۱۰ ۵: ۵۵، ۴۸: ۶ ۱۱ ۶: ۹۷ ۱۲ ۱۰: ۵-

خود قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربوں کی تقویم پورے طور پر، بروج اور منازلِ قمر سے وابستہ تھی، اور کیوں نہ ہوتی، اس لئے کہ اُن کی تمامتر عبادات کا انحصار مخصوص طوالع، صحیح اوقات اور مقررہ ساعتوں پر تھا، قرآن مجید میں ہے :-

"مبارک ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بُرج بنائے، اور ان میں سراج یعنی سورج، اور نورانی چاند کو مقرر کیا" (۲۵ : ۶)

جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربوں کے نزدیک سورج اور چاند بروجِ فلکی میں مقررہ حرکتیں کرتے رہتے تھے،

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے :-

"اور چاند کے لئے ہم نے ٹھیک اندازہ کے مطابق منازل مقرر کردیں، حتیٰ کہ وہ سوکھی ٹہنی کی شکل میں عود کرتا رہتا ہے" (ہلال کی شکل اختیار کرلیتا ہے) (۳۶ : ۳۹)

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ اُن کے نزدیک چاند کی مختلف شکلیں (ہلال سے لے کر بدر تک اور بدر سے لے کر دوسرے ہلال تک) انہیں منازل کے اندر مقررہ حسابات کے تحت تبدیل ہوتی رہتی تھیں، تیسری جگہ ان منازل سے سنین اور شہور کا تعلق نہایت ہی واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے :-

"(اللہ کی ذات) وہ ہے، جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا، اور اس کی منزلیں ٹھیک اندازے کے مطابق مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان سکو" (۱۰ : ۵)

جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا، کہ عربوں میں ماہ و سال نہ تو میٹونی دور (MOTONIE CYCLE) کے پابند تھے، اور نہ ان میں یہودیوں کے طریقۂ کبیسہ کی کوئی منزلت تھی، بلکہ عربی سنین و شہور کا تعلق صرف بروج اور منازلِ قمر کے صحیح حسابات پر تھا، یعنی ہندوؤں کی طرح راسون اور نچھتروں پر جس کی وجہ سے ان کے حسابات کو زیادہ صحیح ہونا چاہیئے۔

دنیا کی مشترک قوموں میں اجرامِ سماوی کی پرستش کرنے والوں کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل ہے، جو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر دیکھا جائے تو ان کے عجیب و غریب توہمات نے

ہمارے موجودہ علمِ ہیئت کی بنیاد آج سے ہزاروں سال پہلے رکھ دی تھی، نہ صرف یہ کہ سورج اور چاند کی سالانہ رفتار، منازلِ قمر کا پورا پورا بُعد، بروج میں نیرّین کے ٹھیک ٹھیک مقام دریافت کرنے کے اصول، کسوف وخسوف دریافت کرنے کے قاعدے، سیاروں اور ستاروں کے سالانہ اتار چڑھاؤ انھیں لوگوں نے دریافت کئے بلکہ موجودہ علمِ ہیئت کے ۸۰ فی صدی اصول آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے رائج کر دیئے گئے تھے۔

"بروج" اور "منازل" کی تقویمی افادیت سمجھنا کچھ زیادہ پیچیدہ یا مشکل مسئلہ نہیں، اور اگر ہم طلوعِ فجر سے کچھ پہلے یا غروبِ آفتاب کے کچھ بعد (ایک خاص وقت مقرر کرکے) اس بات کا مشاہدہ شروع کر دیں کہ اُفقین اور سمت الراس پر کون کون سے ستارے موجود ہیں، اور اِن ستاروں کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے تو چند ہی روز میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان ستاروں کے ارتفاع میں مسلسل فرق پڑ رہا ہے، اور انکے مقامات پیہم تبدیل ہو رہے ہیں، مشرق سے کچھ نئے ستارے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے اور مغرب میں ان کے متقابل ستارے دیکھتے دیکھتے غروب ہو جائیں گے، سمت الراس پر آج جو ستارے تھے، وہ چند ہی روز میں، مغرب کی جانب جھکے ہوئے نظر آئیں گے، یہ مشاہدہ اگر مسلسل جاری رہے تو اُفقین اور سمت الراس پر ستارے بالکل بدل جاتے ہیں، اور جن ستاروں سے مشاہدہ شروع کیا گیا تھا وہ کہیں سے کہیں نکل چکتے ہیں، اور ساتھ ہی موسم بھی بدلتا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً موسمِ بہار میں جو ستارے غروبِ آفتاب کے وقت اُفقِ مشرق کے قریب نظر آتے ہیں، وہ موسمِ گرما میں شام کے وقت سمت الراس میں پہنچ جاتے ہیں، اور ان کی جگہ کچھ نئے ستارے طلوع ہونے لگتے ہیں۔ افقِ مغرب میں جو ستارے تھے، وہ بالکل نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ وہ ستارے لے لیتے ہیں جو سمت الراس میں مشاہدہ کئے گئے تھے، اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سورج ستاروں میں اپنا مقام بدلتا رہتا ہے تو دوسری جانب یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسی تبدیلی کا اثر موسموں اور فصلوں پر بھی پڑتا ہے۔

اگر دن کے وقت ستارے نظر آسکتے تو سورج کی یہ حرکتِ مجازی ایک ہی دن میں نظر آجاتی، فرض کیجئے کہ ۲۰ اگست کی صبح کو ہمیں قلب الاسد (REGULUS) نظر آسکتا تو ہم دیکھتے کہ سورج تارے سے

تھوڑا جنوب و مغرب کو ہے، یہ مشاہدہ اگر تمام دن جاری رہتا تو شام کو ستارہ سورج سے شمال میں نظر آتا،

دوسرے دن صبح کو سورج ہمیں ③ پر نظر آتا اور شام ہوتے ④ پر پہنچ جاتا[1]، اس طرح کچھ ہی دن میں سورج اور ستارے کا بُعد بڑھتے بڑھتے کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا۔

چوں کہ سورج دن بھر میں اپنے قطر مری کی برابر فاصلہ طے کر لیتا ہے اس لئے سورج کی ستاروں میں یہ رفتار آسانی سے نظر آسکتی تھی، لیکن مشکل یہ ہے کہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے سورج کا صحیح مقام دریافت کرنے کے لئے دوسرے وسائل اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ تاکہ فصلی پیش بینی سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

قدیم قوموں نے اس سلسلے میں متعدد طریقے اختیار کئے تھے جن میں سب سے زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ چاند کی مختلف رویتوں کے ذریعہ سورج کا صحیح مقام دریافت کیا جائے، کیوں کہ ان دونوں میں ایک خاص اور قریبی تعلق ہے۔

ستاروں میں سورج جس راستے سے گذرتا نظر آتا ہے اُسے اصطلاحاً طریق الشمس یا مدارِ شمسی (ECLIPTIC) کہا جاتا ہے، یہ راستہ کرۂ فلکی میں ایک "دائرۂ عظیمہ" (GREAT CIRCLE) بناتا ہے۔ جس کو سورج پورے ایک سال یعنی (365·24) دن میں طے کرتا ہے، مدارِ شمسی کے اردگرد جو "مجامع النجوم" ہیں ان کو "بروج" کہا جاتا ہے، جاہلی منجمین نے منطقۃ البروج (ZODIACAL BELT) کو ۱۲ مہینوں کی مناسبت سے ۱۲ حصوں میں تقسیم کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ سورج ہر "برج" میں ایک ماہ رہتا ہے، ان بروج کے نام حسب ذیل تجویز کئے گئے تھے۔

۱- حمل، ۲- ثور، ۳- جوزا، ۴- سرطان، ۵- اسد، ۶- سنبلہ
۷- میزان، ۸- عقرب، ۹- قوس (رامی) ۱۰- جدی، ۱۱- دلو، ۱۲- حوت،[2]

---

[1] ہیئتِ جدید ۱/۱۵- [2] کتاب الانواء/۱۲۱ کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/۱۷۰ نیز دیکھئے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۲، ۱۴

چونکہ چاند کا مدار، مدارِ شمسی سے تھوڑا مختلف ہے، اور کچھ اس طرح واقع ہے کہ یہ دونوں مدار ایک دوسرے پر پانچ درجے کا زاویہ بناتے ہیں، اس لئے مدارِ قمری، مدارِ شمسی کو دو مقامات پر قطع کرتا ہے یہ دونوں مقام عقدتین (NODS) کہلاتے ہیں، عرب ان میں سے ایک عقدے کو "راس" اور دوسرے کو "ذنب" کہتے تھے، جس نقطے پر چاند "منطقۃ البروج" کے جنوب سے شمال کو گذرتا ہے اس کو "راس" کہا جاتا ہے اور دوسرے کو "ذنب" چاند اپنی ماہانہ گردش میں ۱۴ دن منطقۃ البروج سے شمال کی جانب ہٹتا ہے اور ۱۴ دن جنوب کی طرف، علاوہ ازیں سورج اور چاند کی رفتار میں بھی بیّن فرق ہے، یعنی سورج جتنا فاصلہ ۱۳ دن میں طے کرتا ہے چاند اسی فاصلے کو تقریبًا ایک دن میں ختم کر لیتا ہے، اس لئے منجمینِ عرب نے چاند کی یومیہ رفتار کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی منزلیں علیحدہ مقرر کی تھیں۔ یہ منزلیں بھی اگرچہ منطقۃ البروج ہی کے بعض مخصوص ستاروں کو انتخاب کر کے مقرر کی گئی تھیں، لیکن عربوں نے ان کی تعداد ۲۸ قرار دی تھی، گویا ہر برج میں ۲⅓ منزلیں شمار کی جاتی تھیں، ان منازل کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شرطان (۲) بطین (۳) ثریا (۴) دبران (۵) ھقعہ (۶) ھنعہ (۷) ذارع۔
(۸) نثرہ (۹) الطرف (۱۰) جبھہ (۱۱) زبرا (۱۲) صرفہ (۱۳) عوا (۱۴) سماک
(۱۵) غفراء (۱۶) زبانی (۱۷) اکلیل (۱۸) قلب (۱۹) شولہ (۲۰) نعائم (۲۱) بلدہ
(۲۲) سعد ذابح (۲۳) سعد بلع (۲۴) سعد السعود (۲۵) سعد الاخبیہ (۲۶) فرغ مقدم
(۲۷) فرغ موخر (۲۸) رشا[1]

جاہلی منجمین کی تصریحات کے بموجب سورج سال بھر میں ان منازل کو اس طرح طے کرتا کہ سوائے "جبھہ" کے ہر منزل میں ۱۳ دن لگتے، صرف جبھہ میں ۱۴ دن شمار کئے جاتے تھے[2]۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک شمسی سال عمومی طور پر ۳۶۵ (تین سو پینسٹھ) دن کا تسلیم کیا جاتا تھا[3] کیوں کہ

---

[1] کتاب الانواء/۱۲۱، آثار الباقیہ (سخاؤ)/۳۵۱، ۳۵۲ - الازمنہ والامکنہ ۱/۱۸۶ المخصص ۹/۹

[2] کتاب الانواء/۷۰، قزوینی عجائب/۴۲ [3] ..... قال ابو اسحٰق الزجاجی ان السنۃ اربع اجزاء لکل جزء منہا سبعۃ انواء، لکل نوء منہا ثلاثۃ عشر یومًا ویزداد فیہا یومًا لتتم السنۃ ثلثمائۃ وخمسۃ وستین یومًا وھو المقدار قطع الشمس فلک البروج۔ قزوینی/۵۱
(4 x 7 x 13+1 = 365)

۳۶۵
۲۸ منازل کو اگر ۱۳ دن سے ضرب دی جائے اور جَبہ کا ایک دن بڑھا دیا جائے تو جواب تین سو پینسٹھ (28 X 13 + 1 = 365) آئے گا۔

یہ گویا منجمین جاہلیت کا نجومی سال تھا جس کا تعلق رویتِ ہلال سے نہ تھا، تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ان کے سالانہ حسابات کا مدار محض سورج کی گردشوں پر تھا اور قمری مہینے رائج نہ تھے بلکہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ منجمینِ جاہلیت خود سورج کے صحیح مقام کا اندازہ چاند کی مختلف رویتوں کے مشاہدے سے کرتے تھے، کیوں کہ چاند کے منور حصے کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ کا چاند ہے؟ اور سورج اور چاند میں اس وقت کتنے درجے کا بُعد ہو چکا ہے۔

مثال کے طور پر چاند بحالتِ بدر سورج کے عین بالمقابل تقریباً ۱۸۰ درجے کا زاویہ مستقیم بناتا ہے ساتویں یا آٹھویں تاریخ کو اس کی شکل "دونیم" ہو جاتی ہے جس کو اصطلاحاً "تربیع" کہتے ہیں، اور سورج، چاند اور زمین کا زاویہ تقریباً ۹۰ درجے کا ہوتا ہے، اسی طرح ۳ر تاریخ کو سورج اور چاند کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۶۰ درجے کا ہوتا ہے، اس لئے چاند جب کسی تاریخ کو ان منازل میں نظر آئے گا تو ہم چاند کے صرف منور حصے اور اس کے گرد و پیش کے ستاروں کو دیکھ کر سورج کا صحیح مقام دریافت کر سکتے ہیں اور پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت سورج کس برج یا منزل میں موجود ہے۔ جس کے نتیجے میں موسمی اور فصلی کیفیات کیا ہونا چاہئیں، چنانچہ ابن قتیبہ، مرزوقی اور البیرونی وغیرہ نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ منجمینِ عرب ان نچھتروں کی مدد سے موسمی حالات اور فصلی تبدیلیوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے تھے، اور ان کی تمام تر فصلی اور موسمی پیشین گوئیوں کا انحصار انہیں منازل یا انواءِ فلکیہ کے مشاہدات پر تھا،

مثلاً اعتدالیں (EQUINOXES) کا اندازہ وہ منزل شرطان کے طلوع اور سقوط سے لگاتے تھے جو ان کے نزدیک پہلی نور تھی، جب سورج اس نور میں داخل ہوتا تو یہ اعتدالِ ربیعی (VERNAL EQUINOX) کا زمانہ سمجھا جاتا، اور جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں قدم رکھتا تو اعتدالِ خریفی (AUTUMNAL EQOINOX) کا۔ دونوں حالتوں میں دن رات برابر تسلیم کئے جاتے۔

چنانچہ ایک منجم کہتا ہے :-

" اور جب سورج شرطان میں داخل ہوتا ہے تو زمانہ اعتدال ہوتا ہے، اور دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔" [۱]

ایک اور جاہلی منجم کا قول ہے :

" جب شرطان طلوع ہوتی ہے تو زمانہ مساوی ہو جاتا ہے " [۲]

عربوں کے نزدیک " شرطان " برجِ حمل " کے ابتدائی تاروں کا نام ہے، بلکہ یوں کہئے کہ برجِ حمل کی ابتداء اسی " شرطان " سے ہوتی تھی۔ ہیئت داں کہتے ہیں کہ یکشنبہ ۲۲ مارچ ۲۸۵ء کو ۲۳ بجکر ۱۸ منٹ پر (انڈین اسٹنڈرڈ ٹائم کے بموجب) " نقطۂ اعتدالِ ربیعی " (VERNAL EQUINOX) اور " راس الحمل " (FIRST POINT OF AROIS) یعنی " شرطان " ایک دوسرے سے بالکل مطابق تھے، [۳]

اس پر اتنا اور اضافہ کیجئے کہ موجودہ حسابات کی روشنی میں بھی سورج ۲۱ مارچ کو نقطۂ اعتدالِ ربیعی پر ہوتا ہے اور ابن قتیبہ نے سورج کے شرطان میں داخلے کی تاریخ بھی یہی بیان کی ہے :

" اور آفتاب کا شرطان میں داخلہ ماہ آذار (یعنی مارچ) کی بیس راتیں گذار کر ہوتا ہے۔" [۴]

اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربوں کا مندرجۂ بالا اصول کہ سورج جب " شرطان " میں داخل ہوتا ہے تو دن رات برابر ہو جاتے ہیں شاید ۲۸۵ء کی یادگار ہے، جبکہ نقطۂ اعتدالِ ربیعی اور منزلِ شرطان میں بُعد نہ تھا [۵]

---

[۱] ... فاذا احلت الشمس بینھما اعتدال الزمان واستوی اللیل والنھار قزوینی / ۴۲

[۲] " اذا طلع الشرطان استوی الزمان " ابن قتیبہ / ۱۸

[۳] THE INITAL POINT OF NIRAYANA OR SIDEREAL ZODIAE COINCIDED WITH THE MEAN EQUINOCTIAL POINT (VIZ THE FIROR POINT OF AREIS) OF THE MEAN VERNAL EQUINOX DAY OF 285 A.D. WHICH OCCURRED ON SUNDAY MARCH 22, 23 - 18 I.S.T. OF THAT YEAR ALMANAE 1962 PREFACE PAGE 2

[۴] ... وحلول الشمس بینھما لعشرین لیلۃ تخلو من اذار " ابن قتیبہ / ۱۸ نیز دیکھئے قزوینی / ۴۲ مرزوقی ۱ / ۱۷۷

[۵] آج کل ان بروج کے مقامات تبدیل ہو چکے ہیں، اور برجِ حمل نے " حوت " کی اور " حوت " نے دلو کی جگہ لے لی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس ہر برج اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے۔

اس خیال کی تصدیق خود البیرونی کی اس شہادت سے ہوتی ہے کہ شرطان سے منازلِ قمر کی ابتدا صرف عرب کرتے تھے ورنہ دوسری قوموں میں ثریا سے ابتدا کی جاتی ہے۔[1]

عرب طلوع اور سقوط "شرطان" دونوں سے حساب لگاتے تھے کیوں کہ جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں داخل ہوتا تو پھر دن رات برابر ہوجاتے، اس وقت سورج، چاند کے عین بالمقابل برجِ میزان میں ہوتا۔ یعنی ۲۲ ستمبر کو جو "اعتدالِ خریفی (AUTUMNAL EQUINOX) کا زمانہ ہوتا ہے، اور یہی "سقوط" شرطان کا زمانہ سمجھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان منازل کی ترتیب اور تعین میں جاہلی عربوں نے نہایت ہی صحیح فلکی حسابات کو پیشِ نظر رکھا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہاں منطقۃ البروج کو دائرے کی شکل میں پیش کیا جائے جس میں سورج اور چاند گردش کرتے ہیں۔

اور جو ابن قتیبہ اور مرزوقی وغیرہ کی صراحتوں کے بموجب بروج اور منازل قمر دونوں پر مشتمل ہو، تاکہ آنے والے مباحث کے سمجھنے اور تقویم سازی میں آسانی ہوسکے، اور ہم سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ لگا سکیں کہ جاہلی منجمین ان انواء کے طلوع و سقوط سے موسموں اور فصلوں کا ادراک کس طرح کرلیا کرتے تھے۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ ہر برج میں حسبِ ترتیب ذیل ۲۱ ۱/۳ منزلیں تسلیم کی جاتی تھیں:

۱- برج حمل میں: ——— شرطان، بطین، اور ۱/۳ ثریا
۲- " ثور " : ——— ۲/۳ ثریا، دبران " ۲/۳ ہقعہ
۳- " جوزا " : ——— ۱/۳ ہقعہ، ہنعہ " ذراع
۴- " سرطان " : ——— نثرہ، الطرف اور ۱/۳ جبہ
۵- " اسد " : ——— ۲/۳ جبہ، زبرہ، اور ۲/۳ صرفہ
۶- " سنبلہ " : ——— ۱/۳ صرفہ اعوا، اور سماک

---

[1] آثار الباقیہ (سخاؤ) /۳۴۲

۷- برج میزان میں : غفراء، زبانی اور ۱/۳ اکلیل
۸- 〃 عقرب 〃 : ۲/۳ اکلیل، قلب اور ۲/۳ شولہ
۹- 〃 قوس 〃 : ۱/۳ شولہ، نعائم اور بلدہ
۱۰- 〃 جدی 〃 : سعد زابح، سعد بلع اور ۱/۳ سعد السعود
۱۱- 〃 دلو 〃 : ۲/۳ سعد السعود، سعد الاخبیہ اور ۲/۳ فرغ مقدم۔
۱۲- 〃 حوت 〃 : ۱/۳ فرغ مقدم، فرغ موخر اور، رشا [1]۔

اس صراحت کی روشنی میں اگر ہم برج حمل سے لے کر برج حوت تک اِن انواء کو دائرے کی شکل میں پیش کریں تاکہ ہر برج اور ہر نوء کے متقابل ستارے دریافت کیے جاسکیں تو اُس کی صورت یہ ہوگی (دیکھئے صفحہ ۳۵۳)

چوں کہ سرطان میں سورج کا داخلہ عرب منجمین کے نزدیک ۲۱ مارچ کو ہوتا تھا اس لیے میں نے دوسرے بروج میں سورج کے داخلے کی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں :-

اس دائرے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کو علمِ نجوم میں کافی ادراک تھا، چنانچہ ابنِ قتیبہ، مرزوقی، قزوینی اور خود البیرونی نے بھی ان انواء کے طلوع اور سقوط کے موسمی اور فصلی اثرات اور ان کے ذیل میں جاہلی منجمین کے دل چسپ مسجّعات اور مختلف فارمولے نقل کر کے صفحے کے صفحے رنگین کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کے حسابات اور فارمولے کس درجہ صحیح تھے، میں یہاں ان کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

---

[1] کتاب الانواء/۱۲۱

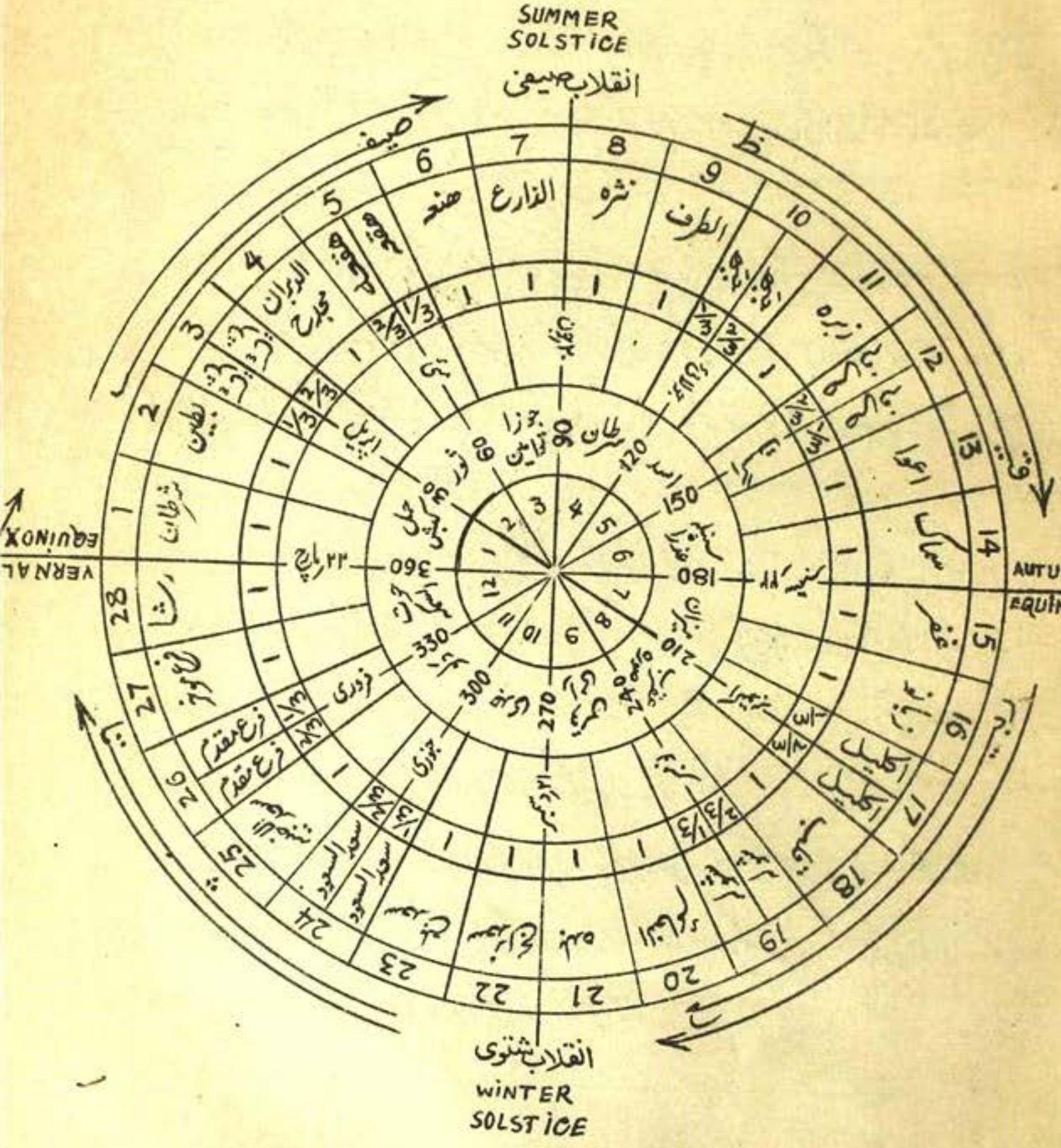

SUMMER SOLSTICE
انقلاب صیفی
AUTUMNAL EQUINOX
VERNAL EQUINOX
انقلاب شتوی
WINTER SOLSTICE

البیرونی نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے، کہ جاہلی عرب اِن انواء سے موسموں کا اندازہ کس طرح لگاتے تھے، ایک جاہلی منجّم کا قول اس طرح پیش کیا ہے :-

"جب چاند بحالتِ بدر ثریّا میں ہو تو "شتا" کی ابتدا ہوتی ہے" [1]

اس کی تشریح کرتے ہوئے، خود البیرونی نے لکھا ہے کہ جب چاند ثریا میں بحالتِ بدر ہوگا، اس وقت سورج سمتِ مخالف میں بُرج عقرب میں ہوگا، (یعنی آخر اکتوبر میں، جو سردیوں کی ابتدا کا زمانہ ہے)

البیرونی نے ایک اور قول اس طرح نقل کیا ہے :-

"جب چودہ[14] تاریخ کا چاند دُبران کے پاس پہنچے تو موسمِ سرما کُل زمین کو لپیٹ لیتا ہے" [2]

اس کی تشریح یُوں کی ہے کہ چاند بحالتِ بدر دُبران میں ہوگا تو سورج اُس وقت بُرج عقرب میں اٹھارھویں منزل یعنی قلب عقرب کے پاس ہوگا، اور پوری دُنیا میں موسم سرما کی آمد آمد ہو جائے گی، یعنی ابتداء نومبر میں (دیکھئے دائرۂ فلکی ص۳۵۱)

یہی نہیں کہ عرب چاند کو صرف بحالتِ بدر دیکھنے سے موسم کا اندازہ لگاتے تھے، بلکہ ہر منزل میں چاند کی مختلف رویتوں کے اصول مقرر تھے، جس سے صحیح صحیح موسمی پیشین گوئیاں کی جاسکتی تھیں، چنانچہ البیرونی نے ایک قول اس طرح نقل کیا ہے :-

"جب تیسری رات کا چاند ثریّا میں ہو تو موسمِ سرما ختم ہوتا ہے۔ [3]

گویا جاہلی منجمین کے سامنے سورج اور چاند کا ہر زاویہ موجود تھا، جس کا مفہوم وہ بخوبی سمجھتے تھے، اور ان انواء کے ذریعہ موسموں اور فصلوں کا صحیح صحیح ادراک رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے جبکہ یہ انواء انکے دین کا ایک جزو تھیں، اور ان کی عبادت داخلِ مذہب تھی۔

---

[1] اذا ما البدر تم مع الثریا اتاک البرد اولہ شتاء - البیرونی / ۳۳۷

[2] اذا ما قارن الدبران یوماً لاربع عشرۃ تمر التمام فقد حف الشتا لکل ارض، البیرونی/۳۳۷

[3] آثار الباقیہ/ ۳۳۷ -

احمد زکی پاشا نے کتاب الاصنام (ابن کلبی) کے تکملہ میں "جبہ" کی پرستش کا ذکر کیا ہے[1] جو دسویں نوء ہے، ابن قتیبہ نے دُبران (چوتھی نوء) کے متعلق یہ حدیث نقل کی ہے:-

"اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے سات سال تک بارش روکے رکھے، اور اس کے بعد پانی پڑے تو منکرین کا ایک گروہ یہی کہے گا کہ یہ بارش "نوء مجدح" نے کی ہے (مجدح دُبران کو کہتے ہیں)[2]

دُبران قلب عقرب کے بالکل مقابلے میں واقع ہے، سورج جب قلبِ عقرب میں ہوتا ہے تو یہ سرِ شام مشرق سے طلوع ہوتی نظر آتی ہے، یعنی آخر اکتوبر اور شروع نومبر میں جو حجاز میں عین برسات کا زمانہ ہے غالباً اسی لئے عربوں نے بارشوں کو اسی نوء سے متعلق کیا تھا، (دیکھئے دائرہ فلکی ص ۳۵۳)

ایک اور حدیث اس طرح ہے:-

"جو کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بارش ہوئی تو وہ میرا مومن اور کواکب کا کافر ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں نوء نے پانی برسایا، وہ میرا منکر اور مومن کواکب ہے۔"[3]

اِن احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ مشکل نہیں، کہ جاہلی عربوں کی موسمی تفہیمات کا تعلق بیشتر اِن انواء ہی سے تھا، اور وہ سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کا پتہ بھی اِن انواء کے طلوع و غروب سے لگا سکتے تھے،

ان نتائج کی روشنی میں یہ بات نسبتاً آسان ہو جاتی ہے کہ جاہلی تقویم کا سرِ اتلاش کرنے کے لئے ہم اپنے قدم اور آگے بڑھائیں، اور قیاسات کو مزید وُسعت دیں۔

بیان کیا جا چکا ہے، کہ عربوں کے نزدیک پہلی نوء شرطان تھی، جس میں سورج ۲۱ مارچ کو داخل ہوتا تھا، جو ٹھیک اعتدالِ ربیعی کا زمانہ ہوتا ہے، اِس بنا پر اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ عربوں کی تقویم کی ابتدا بھی اِسی نقطہ سے ہوتی تھی تو غالباً بیجا نہ تھا۔ کیوں کہ بعض دوسری قوموں کی تقویمیں بھی یہیں سے شروع ہوتی تھیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کی تائید نہ تو واقعاتی شہادتوں سے ہوتی ہے اور نہ منجمینِ عرب اس کی نشاندہی کرتے ہیں،

---

[1] دیکھئے کتاب الاصنام جبہ جب طلوع ہوتی ہے تو عرب میں یہ تازہ کھجوروں (رطب) کی افراط (اور تقریباً تمام اقسام کے پھلوں کے پکنے) کا زمانہ ہوتا ہے (دیکھئے مخصص ابن سیدہ) اور جب اس کا سقوط ہوتا ہے تو یہ اونٹوں (اور اونٹوں کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے جانوروں کا) تولیدی وقت ہوتا ہے۔

[2] ابن قتیبہ ۳۷/ - نیز دیکھئے مسند ۳/ ۷ [3] بخاری نیز دیکھئے موطا الاستمطار بالنجوم)

بلکہ کہا جاتا ہے، کہ عربوں میں فصلوں کی ابتداء اعتدالِ خریفی سے کی جاتی تھی، جو اس کا بالکل متضاد نقطہ ہے۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے:۔

"اور عرب زمانوں کے اوقات کی حد بندی میں بجز مندرجہ ذیل طریقوں کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے اور نہ سال کا آغاز ربیع سے کرتے تھے بلکہ وہ تحدیدِ اوقاتِ فصول میں اپنے وطن کی جانی پہچانی آمد گرما و سرما اور اُن کے اختتام اور بنا سپتی کے پھوٹنے اور بڑھوار اور گھاس پات کے نکلنے اور خشک ہونے کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور زمانوں کے شمار میں فصل خریف سے ابتدا کرتے، اور وہ اس کا نام "ربیع" رکھتے ہیں، کیوں کہ ربیع کا آغاز برسات میں ہوتا ہے، اس کے بعد جاڑے کی فصل آتی ہے۔ پھر جاڑے کے بعد صیف کا موسم ہوتا ہے، اور یہ وہی موسم ہے جس کو لوگ ربیع کہتے ہیں، اور اس فصل میں درختوں میں کونپلیں نکلتی ہیں اور اسے صیف اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے، اور گھاس سوکھ جاتی ہے، اور کچھ لوگ اُسے ربیع الثانی کہتے ہیں" [1]

تاج العروس میں ابو یحییٰ بن کناسہ کا قول ابن قتیبہ کے بیان سے بھی زیادہ واضح ہے:۔

"ازہری نے ابو یحیی بن کناسہ سے جو اس معاملے میں علامہ تھا، سال کے زمانوں اور اس کی فصلوں کے بارے میں نقل کیا ہے، کہ سال کے چار زمانے ہوتے ہیں، "ربیع الاوّل" اور یہی عام لوگوں کے نزدیک خریف کہلاتا ہے، اس کے بعد شِتا (موسمِ سرما) پھر "صیف" اور یہ "ربیع الآخر" ہے، اور پھر قیظ (موسمِ گرما) اور یہ سب عرب بادیہ کا قول ہے، نیز وہ کہتا ہے کہ جو ربیع ایرانیوں کے نزدیک خریف ہے وہ ایلول کی ۳ تاریخ کو شروع ہوتی ہے، اور شِتا "کانونِ اوّل" کی ۳ تاریخ کو، اور صیف جو ایرانیوں کے نزدیک ربیع ہے "آذار" کے پانچ دن گذرنے پر شروع ہوتی ہے، اور قیظ جو ایرانیوں کے نزدیک "صیف" ہے، ۵ ر حزیران کو شروع ہوتی ہے۔" [2]

---

[1] کتاب الانواء/۱۰۳ نیز دیکھئے کتاب الازمنہ ۱/۱۷۴ [2] تاج العروس ۵/۳۴۰، ۳۴۱ نیز دیکھئے کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/۱۷۴، ۱۷۵، اور لسان العرب ۴۶۰/، ۴۶۱

ان صراحتوں سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ عربوں کے نزدیک موسمِ بہار یا فصلِ ربیع کا آغاز اعتدالِ خریفی سے ہوتا تھا، ابنِ کناسہ نے ہر فصل کی ابتدا ہونے کی سُریانی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں۔

ابنِ قتیبہ نے بھی بالکل یہی صراحت کی ہے :-

"ربیع الاوّل کا آغاز جو خریف ہے، "ایلول" کے تین دن گذرنے کے بعد ہوتا ہے اور جاڑے کا آغاز" کانون اوّل" کے تین دن گذار کر، "صیف" کی ابتداء جو" ربیع الثانی" ہے، آذار کے پانچ دن گذرنے کے بعد، اور قیظ کا آغاز حزیران کے چار دن گذار کر" [1]

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ عرب طلوعِ شرطان سے حساب نہیں لگاتے تھے، بلکہ سقوطِ شرطان پر ان کے حسابات کا مدار تھا، یعنی جب شرطان صبح کو مغرب میں غروب، اور شام کے وقت مشرق سے طلوع ہوتی نظر آتی یا بالفاظِ دیگر جب چاند بحالتِ بدر اس نوء میں نظر آسکتا، یہ زمانہ ٹھیک اعتدالِ خریفی کا سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابنِ قتیبہ نے نوء کے معنیٰ ہی "سقوطِ نجم" بیان کئے ہیں [2]

میرا خیال ہے، کہ عربوں کے فلکی حسابات چونکہ بیشتر مشاہداتِ عینی پر مبنی تھے، اس لئے شام کے وقت جب ستارے مشرق سے طلوع ہوتے، تو اُن کے فلکی حسابات کی ابتدا بھی اسی نقطے سے ہوتی، بہرصورت ابن قتیبہ اور ابنِ کناسہ کی نشان دہی کے بموجب عربوں کی فصول چہارگانہ کو اگر ترتیب وار رکھا جائے، اور سُریانی مہینوں کو اُن کے پہلو میں رکھ کر دیکھا جائے تو نتیجہ حسب ذیل ہوگا۔

۱- ربیع الاوّل	۳ر ایلول	۳ر ستمبر
۲- شتا	۳ر کانون اوّل	۳ر دسمبر

---

[1] کتاب الانواء/۱۰۴ - نیز دیکھئے الازمنہ ۱/۱۷۶ - آثارالباقیہ/۳۲۵

[2] کتاب الانواء میں نوء کے معنیٰ اس طرح بیان کئے گئے ہیں "معنی النوء" سقوط النجم منها فی المغرب مع الفجر (کتاب الانواء/۶) یعنی صبح کے وقت جب نجوم الاخذ مغرب کی سمت غروب ہوتے نظر آتے ہیں اس کو نوء کہا جاتا تھا کیوں کہ پھر یہی ستارے شام کو مشرق سے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے، سقوطِ نجم کا صحیح اور آسان اندازہ چاند کی ۱۳ یا ۱۴ تاریخ کو ہوتا ہے جبکہ چاند بحالتِ بدر مشرق سے نمودار ہوکر صبح کو مغرب میں غروب ہوتا ہے، اس وقت جو تارے چاند کے متصل ہوتے ہیں ان کے سقوط کے صحیح وقت کو ایک عام نظر بھی پہچان سکتی ہے، دیکھئے کتاب الانواء/۱۱، نیز دیکھئے مخصص ابن سیدہ ۱۳/۹

۳- صیف (ربیع الثانی) ۵ر آذار ——— ۵ر مارچ

۴- قیظ ——— ۴ر حزیران ——— ۴ر جون

گویا عربوں کے موسم بہار کی ابتداء جس کو وہ ربیع الاوّل کہتے تھے، "ستمبر" سے تسلیم کی جاتی تھی، اب اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ جاہلی تقویم کی ابتداء بھی اسی نقطہ سے ہوئی تھی، اور ان کی تقویم کے تمام مہینے انھیں چار فصلوں پر بعینہٖ اسی ترتیب کے ساتھ بٹے ہوئے تھے، جیسا کہ البیرونی کا خیال ہے، تو گویا ہمیں جاہلی تقویم کا ایک سرا ہاتھ آ گیا۔

البیرونی کا بیان ہے کہ:-

"عربوں کے مہینے چار فصلوں پر تقسیم تھے، جو فصلِ خریف سے شروع ہوتے تھے، جس کو (اہلِ عرب) فصلِ ربیع کہتے تھے، اس کے بعد موسمِ سرما آتا، بعد ازاں بہار کا موسم، جس کو صیف اور بعض لوگ "ربیع الآخر" کہتے تھے، اس کے بعد موسمِ گرما آتا جو قیظ کہلاتا تھا۔" [1]

البیرونی کی اس اہم شہادت کے مطابق اگر بطور تجربہ عربی مہینوں کو محرم سے شروع کر کے ترتیب وار ان چار فصلوں پر تقسیم کر دیا جائے، تو اس کا نتیجہ حسب ذیل ہوگا، اور میرے نزدیک اس قیاس سے حیرت خیز نتائج نکل سکتے ہیں، جو تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھانے کو کافی ہیں، میں نے جدول ذیل میں سریانی مہینوں کے ساتھ ساتھ اُن کے متبادل انگریزی مہینے بھی لکھ دیئے ہیں:-

اعتدالِ خریفی ۲۲ر ستمبر	۱- محرم	ربیع الاوّل ۱	۳ر ایلول	ستمبر
	۲- صفر		تشرینِ اول	اکتوبر
	۳- ربیع ۱		تشرینِ آخر	نومبر
انقلاب شتوی ۲۱ر دسمبر	۴- ربیع ۲	شتاء ۲	۳ر کانون اول	دسمبر
	۵- جمادی ۱		کانون آخر	جنوری
	۶- جمادی ۲		شباط	فروری
اعتدالِ ربیعی ۲۱ر مارچ	۷- رجب	صیف ۳	۵ر آذار	مارچ
	۸- شعبان		نیسان	اپریل
	۹- رمضان		ایار	مئی
انقلاب صیفی ۲۱ر جون	۱۰- شوال	قیظ	۴ر حزیران	جون
	۱۱- ذیقعدہ		تموز	جولائی
	۱۲- ذوالحجہ		آب	اگست

[1] آثار الباقیہ/۳۲۵ - انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ عرب برسات کے موسم کو ربیع کہتے ہیں' ۱/۳۷۱ (عرب میں برسات سرما میں ہوتی ہے)

یہ فرض کرنے کے بعد کہ عربی تقویم کا پہلا مہینہ محرم ہمیشہ نقطۂ اعتدالِ خریفی یا سقوط شرطان کے متصل چاندوں سے شروع ہوتا، اور باقی مہینے اس کے پیچھے پیچھے علی الترتیب نقشۂ بالا کے مطابق چکر کاٹتے رہتے، ہمیں اس نظریئے کو مختلف کسوٹیوں پر جانچنا چاہئے، سب سے پہلے عربی مہینوں کے ناموں پر غور فرمایئے مثلاً ربیع کے بعد جس کے معنی بہار کے ہیں اور جو عربوں کے نزدیک برسات سے شروع ہوتی۔ جمادی کا نام نظر آتا ہے، جو خواہ مخواہ ہمارے ذہنوں کو موسمِ سرما کی طرف لے جاتا ہے، مرزوقی کا بیان ہے، کہ جمادی کے ذیل میں موسمِ گرما کا ذکر اشعارِ عرب میں نہیں ملتا، بلکہ اس کا ذکر ہمیشہ موسمِ سرما کے ساتھ ہوا ہے، سرمائی راتیں سخت اندھیری ہوتی ہیں، ایک شاعر کہتا ہے،

فِی لیلۃٍ من جمادی ذات اندیۃ

لا یبصر الکلب من ظلمائھا الطنبا [1]

جمادی کے بعد رجب اور شعبان کے مہینے آتے ہیں، اور پھر رمضان جس سے گرمی کے جلتے ہوئے موسم کا تصور یقینی ہے، عربی مہینوں کے ناموں کی موسمی ساخت پر البیرونی اور مرزوقی وغیرہ نے لغوی بحث بھی کی ہے [2] اور البیرونی نے بتایا ہے کہ جس زمانے میں یہ نام رکھے جا رہے تھے، اُس وقت موسموں کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، نقشہ بالا کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمادی دسمبر اور جنوری سے مطابقت رکھتا تھا، اور رمضان مئی جون سے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] الآثار صفحہ ۱۶۸

[2] مرزوقی کا قول ملاحظہ ہو،..... ان کثیراً من علماء الرواۃ یزعمون ان شہری ربیع انما سمیا للربیع، وان جمادین انما سمینا للشتاء ووجود الماء - وان شعبان انما سمّی شعبان لاشتعاب الظعن ایاھم عن المرابع للمحاضر، وان شہر رمضان لشدۃ الحر والرمض وان الصفر انسب الی الزمان الذی یسمّی صفری وھذا الذی ذکروا امر قریب لا سعید فی الوھم لانا علی الترتیب نجد ازمان السنۃ عندھم - الازمنہ ۱۶۷/۱۶۸